# جبر و قدر کے درمیان انسانی راہِ عمل

از جناب نعیم صدیقی صاحب

[ یہ مقالہ دراصل ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے ]

انسانی زندگی میں تقدیر و تدبیر یا جبر و اختیار کے دوگونہ عناصر کے بیک وقت مؤثر ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ اچھا خاصا پیچیدہ ہے۔ لیکن اگر اس کے تمام اجزا کو ترتیب وار سمجھ لیا جائے تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

۱۔ کائنات اللہ کی سلطنت ہے اور تمام مخلوق اس کی رعیت۔ اس سلطنت میں اللہ تعالیٰ کے قوانین، نوامیس، اور سُنَن کارفرما ہیں۔ ان قوانین کے کئی دائرے ہیں۔ مثلاً طبعی قوانین، جو سائنسی تحقیقات سے واضح ہوتے جاتے ہیں۔ دوسرے ہیں انسانی نفس، ذہن یا قلب کو انضباط میں رکھنے والے قوانین۔ تیسرے ہیں تاریخ میں اقوام و ملل اور معاشروں کے احوال کے مد و جزر کے قوانین۔

ان سب چیزوں سے خدا کا تکوینی یا مشیّتی نظام عبارت ہے۔ خدا کے تکوینی قوانین اور نظامِ مشیّت کے سامنے ہر چیز اور ہر جاندار بے بس ہے (وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا)

(۲) مگر انسانوں کو تکوین و مشیّت کے اِس جبری نظام میں محدود سی آزادیٔ فکر و عمل AUTONOMY دی گئی ہے۔ وہ تقدیری قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے لیے مختلف راستوں میں سے کسی کا انتخاب کر سکتا ہے اور ان پر گامزن ہونے کی مساعی کو روبعمل لا سکتا ہے۔

(۳) محدود دائرے میں اُسے جو جُزوی اختیار دیا گیا ہے، اس کے صحیح استعمال کے لیے حسبِ ذیل اہتمام کیے گئے ہیں۔

الف۔ انسان کے اندر طلبِ ہدایت کا واضح رجحان پایا جاتا ہے جس کے تحت وہ بُرائی کے مقابلے میں بھلائی، جھوٹ کے مقابلے میں سچ، نامعقول کے مقابلے میں معقول، ظلم کے مقابلے میں عدل، گندگی کے مقابلے میں صفائی، تاریکی کے مقابلے میں روشنی کو پسند کرتا ہے۔ اسی داعیہ کے تحت ہر مذہب، نظریہ اور

نظام کے علم بردار صداقت، راستی، شرافت، انصاف، ہمدردی، اخوت، اور انسان دوستی وغیرہ اصطلاحات کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ ان اصطلاحات کے مفہوم اور ان کے اطلاق میں مغالطے بھی لاحق ہوتے ہیں اور جان بوجھ کر بھی دیے جاتے ہیں۔

(ب) انسان کے اندر سچائی اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کا جو فطری رُجحان، اور خیر و شر اور حق و باطل اور بھلے بُرے کی تقسیم کا جو نفسیاتی داعیہ کام کرتا ہے، اور اسی رُجحان اور داعیے پر اس کا اخلاقی وجود کھڑا ہوتا ہے، اُس کو روشنی اور بینائی بہم پہنچا کر دھندلے تصورات کو واضح شعور اور محکم ایمان تک پہنچانے کے لیے انبیا کے ذریعے خارج میں سامانِ ہدایت بہم پہنچایا گیا ہے۔ الہامی ہدایت انسان کے جذبۂ طلبِ ہدایت کی پیاس بجھانے کے لیے حکمت حیات کا مشروب فراہم کرتی ہے۔ انبیاء الہامی ہدایت کے ذریعے رُشد و غَی کو چھانٹ کر یا حق و باطل، حلال و حرام کو نتھار کر الگ الگ کر دیتے ہیں۔ (قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ)۔

(ج) فطرت میں مشاہدہ و تجربہ کے ذریعے حصُولِ علم کا جو محرک رکھا گیا ہے اسے بھی ہدایت کے ذریعے انفس و آفاق کا مشاہدہ کر کے اور تاریخ کے تجربات سے استفادہ کر کے صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے چند اصولی نشانات و آیات بہم پہنچا دی گئی ہیں۔

۴۔ انسان کو محدود آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر طلبِ ہدایت کا جذبہ اور خارج میں الہامی دعوت کا سامان فراہم کر دینے کے بعد اسے اس خاص دائرے میں کھلا موقع دیا گیا ہے کہ اپنا راستہ خود تلاش کر کے اس پر بڑھنے کی خود کوشش کرے۔ (فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ)۔ یعنی اس دائرے میں کسی کو جبرًا نہ ہدایت کی طرف مار باندھ کر لایا جاتا ہے، نہ جبریّت کی زنجیروں میں جکڑ کر مشیتِ الٰہی اسے ضلالت کی طرف لے جاتی ہے، بلکہ ہر شخص قوانینِ مشیّت کے تحت اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر ہدایت کی طرف بڑھے تو فی الحقیقت ان کے اندر اس کا استحقاق موجود تھا، اور اگر ابوجہل محروم رہا تو وہ اس کا مستحق تھا کہ وہ محروم رہے۔

۵۔ قرآن میں واضح کیا گیا ہے کہ جو شخص جس طرح کا ارادہ و فیصلہ کر لیتا ہے قدرت کی دی ہوئی طاقتیں اور صلاحیتیں اسی کے حق میں کام کرنے لگتی ہیں اور وہ خود بھی تمام ذرائع و وسائل کو اپنے ارادے اور فیصلے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سو جو جدھر چلنا چاہتا ہے، مشیت اس کے لیے ادھر جانے کے پھاٹک کھولتی چلی جاتی ہے۔ خدا ترسی

کو پسند کرنے والوں کے لیے کلیہ یہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو ہماری طرف بڑھنے کے لیے سعی و جہد کریں گے ہم ان پر اپنی راہیں خود آشکارا کرتے جائیں گے۔ نفس پرستی کو پسند کرنے والے کردار کے متعلق فرمایا: نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى۔ ہم اسے اُدھر ہی لے جائیں گے جدھر کو اپنا رُخ پھیر کر اس نے جانا پسند کر لیا ہے۔ یہ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى اتنا جامع کلمہ ہے کہ اس کا اطلاق ٹھیک اسی طرح خیر و شر کی دونوں راہوں پر چلنے والے انسانوں کے لیے یکساں ہوتا ہے جیسے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔

اسے آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں:

آپ بہ حیثیت کاشتکار جب دل میں فیصلہ کر کے ایک خاص بیج بو دیتے ہیں تو پھر قدرت کی ساری قوتیں زمین، پانی، سورج، شبنم، ہوا، موسم اس بیج کو اُگانے اور نشوونما دینے میں معاون ہوتے ہیں۔ آپ نے سوچ سمجھ کر بکائن یا تھوہر کے درخت لگائے۔ اب یہی کاشت شدہ درخت پروان چڑھیں گے اور یہ ممکن نہیں کہ یکایک بدل کر یہ آم اور سیب کے درخت بن جائیں اور ان پر نہایت خوشبودار میٹھا پھل آنے لگے۔ اسی طرح اگر آپ آم اور سیب کاشت کریں گے تو اگر بقیہ تدابیر بھی باحسنِ وجوہ عمل میں لائی گئی ہوں تو غیر معمولی حوادث کی زد سے جو بھی درخت بچیں گے وہ جب بھی پھل دے سکیں گے تو خوشبودار اور میٹھے پھل ہی دیں گے۔

ٹھیک اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے نفس کی کھیتی میں عبادتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کے ارادے کا بیج بوتا ہے تو وہ نشوونما پا کر اپنے برگ و بار لائے گا۔ بخلاف اس کے اگر وہ چوری یا خیانت یا زنا یا اغوا کے کسی فعل کے فیصلے کا بیج بوتا ہے تو اس کی تمام قوائے فکر و عمل اسی فعل کی کامیابی کا منصوبہ سوچنے میں لگ جائیں گی۔ اور اسے مال، اوزاروں، اسلحہ اور حمل و نقل کے ذرائع میں سے جو کچھ حاصل ہوگا ان قوتوں کو بھی وہ اس مقصد کے لیے استعمال میں لائے گا۔

(۶) ضروری نہیں کہ کسی شخص کے ہر ارادے، فیصلے اور سعی میں ضرور کامیابی ہو، یا اگر ہو تو لازماً سو فیصد ہو۔ قدرت کے نظامِ تکوینی کے بہت سے عوامل اس کے گرد ایسے کام کر رہے ہوتے ہیں جن پر آدمی کی اول تو نظر نہیں جا سکتی اور نظر جاتی ہے تو بس نہیں چلتا۔ ایسے بہت سے موانع کو ہم حسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے بیان کیا کرتے ہیں۔

لیکن مجرّد ایک ارادہ کرنے، ایک فیصلہ طے کرنے اور ایک سعی کا آغاز کرنے سے انسان کے نفس پر قوانینِ مشیت کے تحت ایک خاص عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ہماری شخصیت ایسے ہر خیال تک سے متاثر ہوتی ہے، اور ارادہ

سعی تو خیال سے آگے کی بہت مؤثر چیز ہے۔

۷۔ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا کی حقیقت گذشتہ اشارات پر غور کرنے سے آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں نفسِ انسانی کبھی حالتِ قائمہ STATIC CONDITION میں نہیں رہتا۔ وہ یا تو بلندی کی طرف بڑھے گا یا پستی کی طرف۔ یا آگے کو اقدام کرے گا یا پیچھے سرکے گا۔ اچھے یا بُرے تغیر کا عمل اس پر جاری رہے گا۔ اور یہ عام جسمانی زندگی میں بھی زیرِ مشاہدہ آتا ہے۔ آپ ایک بیماری سے اگر تغافل برتتے ہیں، بیماری کو بیماری نہیں مانتے، طبیب کی طرف رجوع نہیں کرتے، بد پرہیزی جاری رکھتے ہیں، تو مشیت کے قوانین کے تحت یہ ممکن نہیں کہ بیماری اپنے ابتدائی مرحلے میں رُکی رہے۔ نہیں، اگر صحت و شفا کی طرف جانے کا اہتمام نہ کیا جائے گا تو بیماری میں اضافہ ہوگا۔ یہ اضافہ چونکہ قدرت کے تقدیری قوانین کے تحت آتا ہے اس لیے اس کی نسبت خدا کی طرف کرنا بالکل برحق ہے۔ مگر اس سے قصوروار آدمی بری الذمہ نہیں ہو جاتا جیسے پھانسی لگنے والے کسی مجرمِ قتل کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ حکومت نے اسے پھانسی دے دی، یا جج نے پھانسی کا حکم سُنا دیا، یا جیل کے عملے نے پھانسی کا رسہ اس کے گلے میں ڈال دیا، مگر اس سے جُرم و قصور کی ذمہ داری حکومت یا جج یا جیل کے عملے کی طرف منتقل نہیں ہوتی، بلکہ وہ مُجرم قاتل ہی کے سر رہتی ہے۔ اسی لیے حقیقت کے اعتبار سے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص نے اپنے آپ کو اپنے اعمال کے ذریعے پھانسی کے تختے تک پہنچایا۔ یہی مفہوم ہے اُن آیات کا جہاں معذّب اقوام کی تباہی کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔

۸۔ مُہر ثبت کر دینے کا مفہوم بھی آپ تھوڑے سے غور سے خود سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ یہاں مُہر کرنے کے الفاظ ایک پُراسرار غیبی حقیقت کی تعبیر کے لیے تمثیلاً استعمال ہوتے ہیں۔ ان سے مُراد یہ ہے کہ بعض لوگوں کے نفس کا روشنی دینے والا دریچہ خود ان کے طرزِ فکر و عمل کی وجہ سے قوانینِ الٰہی کے تحت بند کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر وہ شخص جو ہدایت سے محروم ہو یا کسی غلط مسلک پر زندگی گزار رہا ہو اس کے دل پر مہر کر دی جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دعوتِ حق پر کوئی ایسا شخص ایمان نہ لاتا جو شرک یا کفر یا فسق و فجور میں مبتلا ہو۔ یہ حادثہ صرف اُن لوگوں کو پیش آتا ہے جو خود پر طلبِ ہدایت کا راستہ کسی تعصب، کسی ضد، ہٹ یا اندھی نفسانیت کی رکاوٹ سے بند کر دیتے ہیں۔

آپ عام زندگی میں کیا یہ نہیں دیکھتے کہ چھوٹے چھوٹے واضح معاملات پر گفتگوؤں کے دوران میں [illegible]

کے کچھ لوگ، یا کاروباری شرکاء، یا عام دوست احباب، کسی تعصب یا ضد، یا کسی اندھی جذباتی رو، یا خواہش پرستی اور بندگیٔ مفاد کے کسی رجحان کی زد میں آجاتے ہیں تو وہ بات کو سمجھ کر بھی نہیں سمجھتے، سن کر بھی نہیں سنتے۔ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ وہ جان تو لیتے ہیں مگر مانتے نہیں یہی سیاسی اختلافات میں ہوتا ہے اور یہی صورت دینِ حق کے بارے میں فیصلہ کرنے میں پیش آتی ہے۔

پس امرِ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ خدا نے ان کی فطرت میں طلبِ ہدایت کا جو دریچہ کھولا تھا اس کے آگے انہوں نے خود ہی تعصب یا ضد یا مفاد پرستی کی آہنی چادر مڑھ دی۔ یہی ہے کسی کے قلب و ذہن کا مُہر زدہ ہونا۔ انسان کو محدود دائرے میں جو آزادیٔ فیصلہ عطا کی گئی ہے اس کے معاملے میں خدا کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ دل کے دریچے بند کرنے والے کا دریچہ زبردستی کھول دے۔ جب اس نے خود ہی پسند کیا کہ اس کا طلبِ ہدایت کا دریچہ بند رہنا چاہیے تو قدرت بھی اسے بند ہی رکھے گی۔

ایسے ہی لوگ ہیں جن میں بعض خود بھی اپنی داخلی حالت کا شعور رکھتے ہیں (عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃ) اور ان کے اس قسم کے اقوال قرآن میں ملتے ہیں کہ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ، جان لو کہ ہمارے دلوں کے دروازے بند ہیں، وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ، ہمارے کانوں میں گرانی ہے جو داعیٔ حق کی بات سننے کے قابل نہیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس استحقاقِ خاص کی بنا پر ایسے لوگوں کو خدا تعالیٰ زبردستی طالبِ ہدایت بنا دے اور جو شخص مثلاً چوری کرنے کے ارادے سے جا رہا ہے اسے خدا کے فرشتے مار بندھ کر مسجد کی صفِ نماز میں جا کھڑا کریں۔

مُہر فی الحقیقت اس کے دل پر لگتی ہے جو خود اپنے دل کو مُہر زدہ اور منہ بند رکھنا چاہتا ہے کسی طالبِ ہدایت اور جویائے حق کے دل پر مُہر نہیں لگائی جاتی درآنحالیکہ وہ صحیح زندگی کا راستہ معلوم کرنے کے لیے تگ و تاز کر رہا ہو اور محض غفلت و نادانی کا شکار ہو کر غلطیاں کر رہا ہو۔

۹۔ مُہر لگ جانے کے سلسلے میں ایک حدیث بھی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جب انسان پہلی بار کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ نمودار ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ و اصلاح کر لے تو یہ نقطہ مٹ جاتا ہے، ورنہ وہ مزید گناہ کرتا ہے اور قلب کے سیاہ داغ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پورا قلب یا نفسِ انسانی سیاہی کے گھیرے میں آجاتا ہے۔ قرآن نے اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓـئَتُهٗ کے الفاظ سے اسی کیفیت

کو بیان کیا ہے۔ دوسرے موقع پر فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ اور فِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ کے الفاظ سے اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

حدیث مذکور میں دراصل اُس قانونِ عادت کا بیان ہے جو کائنات کی دوسری موجودات کی طرح انسانی ذہن و نفس پر بھی کارفرما ہے۔ درخت کی کسی ٹہنی کو آپ زور سے ایک بار جھکائیں تو وہ ہاتھ سے چھوٹتے ہی اگرچہ واپس جائے گی مگر اپنی سابق جگہ سے قدرے پیچھے ہی رہ جائے گی۔ آپ دوبارہ، سہ بارہ یہی عمل کرتے رہیں، بالآخر وہ شاخ اپنے اصل مقام سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جائے گی۔ ٹھیک یہی کچھ نفسیاتی اور اخلاقی دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ کسی غلط حرکت کے نتیجے میں قلب اپنے اصل صحت مندانہ مقام سے تھوڑا سا ہٹ جائے گا اور برسوں غلط حرکات کرتے رہنے کے نتیجے میں وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ کبھی واپس اپنی جگہ پر لوٹ سکے۔

گناہ در گناہ کے چکر میں پڑ جانے سے بُری عادات انسان کو جکڑ کر اس طرح بے بس کر دیتی ہیں کہ وہ ہدایت کی بات سُن کر، سمجھ کر، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسے پسند کر کے اور اس پر چلنے کی خواہش اپنے اندر محسوس کرنے کے باوجود خود پیدا کردہ قفس سے نکل نہیں سکتا۔ یہ صورت بھی مُہر لگ جانے کے مشابہ ہے۔

قوتوں کے غلط استعمال کے نتائج سے بچنا قدرت کے عادلانہ قوانین کے تحت ممکن نہیں ہے اگر ایک شخص آنکھوں میں ہر روز مرچیں ڈالتے ڈالتے اندھا ہو جاتے، یا کانوں کے پردوں کو خود ہی سلائی لے کر چھید ڈالے، یا افیون اور چرس کے استعمال سے دماغی قوتوں کو مضمحل کر لے تو ایسی لغویات کے نتیجے میں وہ قدرت کی عطا کردہ کسی بھی نعمت سے اگر محروم ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔

ٹھیک اسی طرح اپنے دل پر مہر کرنے والا بھی اپنے نفسیاتی قویٰ اور قلبی داعیات کے ساتھ غلط سلوک کرتا ہے اور ان کے اچھے پہلوؤں کو خود ہی تباہ کر کے ان کا نقصان بھگتنے کا سزاوار بنتا ہے۔

آخر کوئی شخص اگر خودکشی ہی پر تُل جائے اور وہ کسی پہاڑ سے چھلانگ لگا دے، تیز رفتار گاڑی کے سامنے آ کر سر دے دے، یا پٹرول چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا لے، یا پستول کی گولی سر یا قلب سے پار کر لے، تو اس کا جو کچھ بھی نتیجہ ہو گا وہ اگرچہ قوانینِ الٰہی اور اذنِ الٰہی اور مشیتِ الٰہی کے تحت ہی ہو گا، لیکن اس کی ذمہ داری ہر لحاظ سے خودکشی کرنے والے پر عائد ہو گی۔ آپ قدرت سے جس طرح یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ پہاڑ سے کودنے والے کے لیے کششِ زمین کو معطل کر دے، اسی طرح

آپ اس سے یہ امید بھی نہیں لگا سکتے کہ اپنے آپ کو ضلالت اور طغیان اور تعصبات اور ضدّم ضدّا میں میں مبتلا کرنے والے اور طلبِ ہدایت کے جذبے کو مار دینے والے آدمی کو خدا کی مشیت زبردستی ہدایت یافتگان میں لا کھڑا کرے۔

دلوں کا مہر زدہ ہونا ایک خاص طرح کے قلبی و ذہنی اور عملی و اخلاقی رویّوں کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ اِس دنیا میں جہانِ آفاق کی طرح جہانِ اَنفُس کے ہر واقعہ سے ایک نہ ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے میں بنی اسرائیل کے متعلق یہ آیت واضح رہنمائی دیتی ہے کہ فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّیۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِیَةً ۔ یعنی میثاق باندھ کر اُسے توڑ دینے کے نتیجے میں وہ لعنت زدہ ہوئے اور ان کے قلوب کو پتھروں کی طرح غیر ہدایت پذیر بنا دیا گیا۔

۱۰- موجودات اور خصوصاً انسانوں کے متعلق خدا کا علمِ پیشگی اور چیز ہے اور ان کو جبراً کسی راستے پر ڈالنا اور چیز۔ ان دو چیزوں کے فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ مغالطہ میں مبتلا بھی ہوتے اور جان بوجھ کر مغالطہ انگیزی بھی کرتے ہیں۔

علمِ پیشگی کی مثال (خدا کے علم سے تشبیہ دیئے بغیر) ایسی ہے جیسے ایک مشین کو بنانے یا پل کو تعمیر کرنے والا انجینئر پہلے سے میعاد مقرر کر دیتا ہے کہ یہ دس سال تک صحیح طور پہ کام کرے گی، یا جیسے کوئی ماہر طبیب اپنے زیرِ علاج شخص کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے پہلے سے تیمارداروں کو یہ بتا دے کہ فلاں فلاں مراحل سے گزرنے کے بعد اتنے عرصے میں اس کی موت واقع ہو جائے گی، یا جیسے ایک عالمِ فلکیات ریاضی سے حساب لگا کر یہ بتائے کہ فلاں سیارہ فلاں مقام سے اتنے گھنٹے، اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر اتنی رفتار سے گزرے گا، یا جیسے ہم آپ محدود دائرے میں یہ فیصلہ سُناتے ہیں کہ فلاں گاڑی فلاں اسٹیشن پر اتنے بجے پہنچے گی۔ ان ساری مثالوں میں کسی معاملے سے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی واقعہ کے متعلق پیشگی علم ظاہر کرنے والا شخص ہی اُس واقعہ کو جبراً عمل میں لانے کا ذمّہ دار بھی ہے۔

انسانی علم و شعور کی اِن انتہائی ناقص مثالوں کو سامنے رکھ کر اب ذرا اُس بے پایاں علمِ خداوندی کی طرف آیئے جس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل کے زمانے الگ الگ نہیں ہیں بلکہ بیک وقت سب اس کی نگاہِ علم میں ہیں۔ پھر وہ اپنی پیدا کردہ مخلوق کے قوٰی اور صلاحیتوں، اور اُن کے اندر مختلف

قسم کے حالات میں پیدا ہونے والے ردِّ عمل اور رجحانات، اور ان کے لیے جاری کردہ قوانین کے عمل کے ہر پہلو سے اتنی باریکی سے آگاہ ہے کہ ادنیٰ ترین غلطی کا کوئی امکان اس کے بارے میں تصور میں نہیں لایا جا سکتا ظاہر بات ہے کہ ایسے علیم و خبیر خدا کا علم مستقبل کے بارے میں اتنا ہی صحیح اور قطعی ہوگا جتنا وہ ماضی اور حال کے متعلق ہے۔ اسی علمِ پیشیں کی وجہ سے وہ اپنے پیدا کردہ انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی وجودوں کے متعلق جانتا ہے کہ آزادیٔ فکر و عمل کے محدود دائرے میں اپنی مرضی اور پسند اور ارادے سے کون کب کیا کرے گا۔ علمِ پیشیں تو ایک آئینہ ہے جس میں انسانی کیفیات اور واقعات و حوادث کے تمام چہرے پہلے سے منعکس ہیں۔ اس کے یہ معنی کسی طرح نہیں لیے جا سکتے کہ خدا تعالیٰ خود اپنی عطا کردہ محدود آزادی کے دائرے میں بھی انسان کو اُس کی پسند اور مرضی کے خلاف زبردستی دھکیل کر کسی نظریہ و مسلک کی طرف لے جاتا ہے۔

آخر جب ہم خدا کے پیدا کردہ ناقص العلم انسان کسی شخص کے نفسیاتی مطالعے، یا کسی قوم کے سیاسی یا اقتصادی اور اخلاقی احوال کے مشاہدے کی بنا پر (بشرطیکہ اس کی صلاحیت ہو) بڑی حد تک صحیح پیش بینی کر سکتے ہیں کہ اسے آگے چل کر کیا مراحل پیش آئیں گے، اور ایسی پیش بینی کی بنا پر کوئی معقول آدمی ہمیں پیش آنے والے حالات کا ذمہ دار قرار نہیں دے سکتا، تو خدا کے علمِ پیشیں کی بنا پر ہر انسان کی اپنی ذمہ داری کو اُٹھا کر خدا تعالیٰ کے کھاتے میں کیونکر ڈالا جا سکتا ہے۔

خدا کا علمِ پیشیں صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ پہلے سے جانتا ہے کہ کون سا فرد اور کون سا گروہِ انسانی اپنی محدود آزادی کو اپنی مرضی، پسند اور ارادے سے کیسے استعمال کرنے والا ہے۔ اس کو یہ مفہوم دینا غلط ہوگا کہ خدا نے پہلے سے یہ طے کر دیا ہے کہ فلاں شخص یا فلاں قوم کو فلاں حرکات میں مبتلا کر کے فلاں انجام تک پہنچایا جائے گا۔

۱۱۔ اصل میں لوگوں کو مغالطہ اُن آیات کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوتا ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے سب کچھ ایک کتاب میں لکھ رکھا ہے، یا وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ تمام امور کو قلمِ قدرت رقم کر دینے کے بعد خشک ہو چکا ہے۔

ایسی آیات و احادیث خدا کے علمِ پیشیں کے بارے میں یہ واضح کرتی ہیں کہ ایک تو خدا کے علم کا ہر شوشہ محفوظ ہے اس کا کوئی جزو کبھی ساقط نہیں ہو سکتا، اور دوسرے یہ کہ اس علم میں (نعوذ باللہ) کوئی

ایسی غلطی اور کمی نہیں ہے کہ قلمِ قدرت کو بار بار ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آ جائے، یا کوئی واقعہ اس علم کے خلاف پیش آ جائے۔

اِس علمِ پیشیں ہی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اَجرامِ فلکی کی جسامت، رفتار اور ان کی ترتیب مقرر کی ہے۔ اسی کی بنا پر طبعی اور کیمیاوی عناصر کی اقسام اور ان کی خصوصیات مقرر کی گئیں۔ اسی کے مطابق حرارت، حرکت اور کشش جیسے قوانین بنائے گئے ہیں۔ اسی کی بنا پر اشیاء کی ڈیزائننگ کی گئی ہے۔ اسی کی بنا پر جاندار مخلوق کی ضروریات کے لیے رزق کے خزائن فراہم کیے جاتے ہیں اور ان کی زندگی کے مختلف لوازم پورے کیے جاتے ہیں۔ اسی علمِ پیشیں کی بنا پر مختلف کاموں کے لیے فرشتوں کی مناسب تعداد کو ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ اسی کے تحت ہر وجود کی اجلِ مسمّٰی یا مہلتِ بقا معین کی جاتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں پوری کائنات اور خصوصاً عالمِ انسانی کے لیے خدا کی تکوینی حکومت ایک اٹل منصوبہ بندی (PLANNING) کے مطابق کام کرتی ہے۔ خدا کے ہاں سہ سالہ یا پنج سالہ یا دہ سالہ منصوبے نہیں بنتے کہ ہر بار تجربے کے تحت نئے سرے سے معاملات کا نقشہ بنایا جاتا ہے، بلکہ اس نے ازل تا ابد کے درمیان نمودار ہونے والے موجودات کے لیے لامتناہی منصوبہ بندی یکبارگی کر لی ہے۔

اس منصوبہ بندی کے تحت پیشتر سے یہ طے ہے کہ جنت میں کتنے افراد کے لیے کتنی جگہ درکار ہوگی۔ اور جہنم میں کتنے افراد کے لیے کتنی گنجائش ہونی چاہیے۔ اِسی کے مطابق میدانِ حشر کا مطلوبہ رقبہ پہلے سے معیّن ہے۔

اب ذرا یہ فرمائیے کہ کیا آپ ایسے خدا کے تصور کو قابلِ قبول گردان سکتے ہیں جسے آج تک کے ہونے والے واقعات کا تو علم ہو، لیکن وہ نہ کل کی مخلوق کا اندازہ کر سکتا ہو اور نہ اس کے احوال و ضروریات کا کوئی علم رکھتا ہو؟ بلکہ بار بار فیصلے کر کے تجربے کی روشنی میں ان کو بار بار بدلتا رہے اور کائنات کسی طے شدہ منصوبے پر چلنے کے بجائے کبھی کسی طرز پر چل رہی ہو اور کبھی کسی طریق پر۔ کبھی اَجرامِ فلکی کی رفتاریں بھی کچھ اور ہوں اور پھر کسی دن اچانک کچھ اور ہو جائیں۔ کبھی سیاروں کے مدار کسی اور شکل کے ہوں اور کبھی کوئی اور شکل اختیار کر لیں۔ کبھی دریا نشیب کو بہا کریں اور کبھی اچانک بلندی کی طرف بہنے لگیں۔ کبھی زمین یکایک اپنی کشش کھو بیٹھے اور زہرہ یا مریخ کی کشش اتنی زیادہ

بڑھ جاتے کہ انسانوں سمیت زمین کسی دوسرے سیارے پر جا گرے۔ یا زمین پر کبھی سامانِ غذا کی بھرمار ہو اور انسان گنتی کے رہ جائیں اور کبھی انسان تو چیونٹیوں کی طرح رینگتے دکھائی دیں لیکن غذائیات کا ذخیرہ ختم ہو جائے۔ کبھی نباتات آکسیجن بنانا چھوڑ دیں یا کبھی حیوانات کاربن ڈائی آکسائڈ فراہم نہ کر سکیں۔

اگر ایک عالم الغیب خدا کائنات کا کارپرداز نہ ہوتا تو نظامِ عالم قطعی طور پر بے ڈھنگا اور بے توازن ہوتا۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ چل ہی نہ سکتا۔

۱۲- عام طور پر مغالطہ اٹھانے والے خدا کے علمِ پیشیں کو ارادۂ پیشیں یا فیصلۂ پیشیں کے معنی میں لیتے ہیں اور اسی تصور کے تحت بحثیں چھیڑتے ہیں۔ بس یہی حقیقت اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ خدا کا علمِ پیشیں، حکمِ پیشیں یا فیصلۂ پیشیں سے مختلف نوعیت رکھتا ہے۔

۱۳- آپ اور آپ کے کمیونسٹ، دوست اگر یہ جانتے ہوں کہ جدید نفسیات نے انسان کو کس درجہ شدید مجبوری کے مقام پر رکھا ہے، اور پھر اسے اقتصادی اور سماجی اور تاریخی عوامل کے درمیان کتنا بے بس قرار دیا ہے، تو پھر آپ دونوں یہ اندازہ کر سکتے کہ اسلام کے دیئے ہوئے تصورِ تقدیر سے تو کئی گنا زیادہ تصورِ جبریت جدید فلسفوں نے دیا ہے۔ ان فلسفوں کو سامنے رکھیں تو انسان قاتل اور چور اور شرابی اور جھوٹا اور خائن اور دغا باز بن کر بھی کسی طرح اپنے افعال کا اخلاقاً ذمہ دار اور قانون کی نگاہ میں مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ستم یہ ہے کہ انسان کو اتنی شدید اور خوفناک قسم کی جبریت کا شکار قرار دینے کے بعد جمہوری اور اشتراکی دونوں قسم کے نظاموں میں اُس کے ناپسندیدہ افعال پر اُسے اخلاقاً معتوب اور قانوناً شدید سزاؤں کا مستوجب ٹھیرایا جاتا ہے۔ اگر آپ جدید دَور کے تصورِ جبریت کو جسے اشتراکی فلسفہ اور بھی زیادہ سنگین بنا کر سامنے لاتا ہے، پوری طرح سمجھ لیں تو پھر آپ اپنے کمیونسٹ دوست سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس تصورِ جبریت کے سانچے میں رکھ کر ذرا بتائیے کہ انسان اخلاقی یا سماجی لحاظ سے اپنے افعال کا کیسے ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے؟ جو لوگ انسان کو جدید تصورِ جبریت میں رکھ کر دیکھتے ہیں وہ اگر تقدیر و تدبیر یا جبر و اختیار کے درمیان کے اُس مقام پر اعتراض اٹھائیں جس پر اسلام نے انسان کو کھڑا کیا ہے تو یہ نہایت مضحکہ خیز بات ہوگی۔

میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ جدید تصورِ جبریت کو یہاں پیش کر سکوں، اس کے لیے آپ کو نفسیات اور جدید فلسفۂ تاریخ اور سماجیات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (باقی)